عقل و ادراک

عام طور پر فلسفی ہی عقل کے پرستار شمار ہوتے ہیں۔ صوفیہ معرفتِ ذات وصفات کو عقل سے ماوراء سمجھتے ہیں۔ عرفان کے لیے دوسری قسم کے وجدان کی ضرورت ہے۔ عجزِ ادراک صوفیانہ نظریۂ حیات کا جزوِ لاینفک ہے۔ حقیقتِ مطلقہ یا خدا کو کما حقہٗ پہچاننا نہ کسی ولی کے بس کی بات ہے اور نہ کسی نبی کو یہ کمال حاصل ہوا۔ اس کے باوجود اکابر صوفیہ عقل کے مخصوص وظیفے کے منکر نہیں۔ مثنوی مولانا رومؒ میں عشق کی مدح سرائی کے ساتھ ساتھ عقل کی مدح سرائی بھی موجود ہے۔ صورت کے اندر معنی کی تلاش عقل ہی کا کام ہے۔ اور عقل ہی ایسی چیز ہے جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن حسی اور استدلالی عقل ادراکِ حقائق میں خاص حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اگر ان حدوں سے آگے پرواز کرنا چاہے تو اس کے پَر جل جاتے ہیں ؎

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

غالبؔ معانی کا طالب ہے۔ ایک خط میں کہتا ہے کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی ہے۔ ذوقِ معنی کو آبِ حیات سے افضل قرار دیتا ہے ؎

قضا از ذوقِ معنی شیرۂ می ریخت در جانہا
نمے از لائے پالائش چکید و آبِ حیواں شد

غالبؔ کے کلام میں کافی تعقّل و تفکّر ہے۔ اگرچہ وہ ساتھ ہی عقل کے حدود کو بھی پہچانتا ہے۔ مردِ حکیم عقل کی رسائی اور نارسائی دونوں سے اچھی طرح آگاہ

ہوتا ہے۔ پہلے دیکھیے کہ وہ عقل کی مدح سرائی کس طرح کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ سخن اگرچہ بیش بہا موتیوں کا خزانہ ہے لیکن گہرہائے سخن کی شناخت کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی تاریک راتوں میں موتی بھی دیکھنا چاہے تو جب تک اس پر چراغ کی روشنی نہ پڑے گی وہ دکھائی نہ دے گا۔ سخن فہمی کے لیے چراغِ عقل کی روشنی لازم ہے۔ مغنّی نامے میں یہ اشعار ملتے ہیں ؎

سخن گرچہ گنجینۂ گوہر است　　　خرد را ولے تابشِ دیگر است
ہمانا بشب ہائے چوں پرِ زاغ　　　نہ بینی گہر جُز بہ روشن چراغ

اس پرانی کارگاہِ وجود میں آرائش و پیرائش عقل ہی کی بدولت ہے۔ عقل ہی سے آئینِ حیات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اور عقل ہی سے انسان آئین کا پابند ہو سکتا ہے۔ عقل زندگی کے درہائے بستہ کی کنجی ہے۔ خرد زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اکثر چیزیں استعمال سے خراب ہوتی ہیں اور کہنگی سے ان میں خستگی و فرسودگی پیدا ہوتی ہے لیکن عقل ہی ایسی چیز ہے جسے پیری میں شباب حاصل ہوتا ہے۔ عقل کی ضرورت روحانیوں کو بھی ہے اور استدلال کرنے والے یونانیوں کو بھی ؎

بہ پیرائشِ ایں کہن کارگاہ　　　بدانش تواں داشت آئیں نگاہ
بود بستگی را کشاد از خرد　　　سرِ مرد خالی مباد از خرد
خرد چشمۂ زندگانی بود　　　خرد را بہ پیری جوانی بود
فروغِ سحرگاہِ روحانیاں　　　چراغِ شبستانِ یونانیاں

خلقتِ عالم کے متعلق ایک نظریّہ یہ ہے کہ خدا نے سب سے پہلے عقل پیدا کی۔ اسے بعض لوگوں نے بطور حدیث بھی پیش کیا ہے۔ لیکن مستند احادیث میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ غالبؔ یہی نظریہ اس شعر میں بیان کرتا ہے ؎

نخستیں نمودارِ ہستی گرائے　　　خرد بود کامد سیاہی زدائے

سب سے پہلے جس چیز نے ہستی کا جامہ پہنا وہ عقل تھی جس نے عدم کی ظلمت پہ نور افشانی کی۔ نظر کے پیمانوں سے اس نورِ پاک کو اجزائے خاک پر چھڑکا گیا۔ اگر انسان تیرہ بخت بھی ہو لیکن عقل کے نور سے منور ہو تو دل اس سے روشن رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ میری کفِ خاک میں معانی کی جو ضیا گستری دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ چمکتی ہوئی ریت جو ستارہ سازی کر رہی ہے وہ عقل ہی کا کارنامہ ہے۔ میرے رنگین مصور آئینے میں اسی عالمِ نور کے خیال کا انعکاس ہے ؎

هنوزم در آئینهٔ رنگ بست　　خیالے ازاں عالمِ نور هست
که بینی به تاریکیٔ روزِ من　　فروزاں سوادِ دل افروزِ من
کفِ خاکِ من زاں ضیا گستر یست　　که چوں ریگِ رخشاں به انجم گریست

اگر سخن میں پیغامِ راز کی پیامبری دکھائی دے اور موسیقی وجد آفریں ہو تو سمجھ لو کہ یہ گوہریں دروازہ خرد ہی نے کھولا ہے۔ اور سخن کے مغز میں سے گنجِ گوہر نکالا ہے۔ خرد نے اس ساز پر پردے لگائے ہیں۔ نغمے میں آواز کے اندر جو جادو پیدا ہوا ہے وہ خرد ہی کا کارنامہ ہے ؎

سخن گرچه پیغامِ راز آورد　　سرود ارچه در اهتزاز آورد
خرد داند ایں گوهریں در کشاد　　ز مغزِ سخن گنجِ گوهر کشاد
خرد داند آں پرده بر ساز بست　　برامش طلسمے بر آواز بست

عقل کو عام طور پر بے سوز خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن غالبؔ کہتا ہے کہ اس میں نشہ بھی ہے اور سرمستی بھی پیدا ہوتی ہے۔ جو شخص اس شراب سے سرمست ہوتا ہے وہ معانی کے خزانے لٹانے لگتا ہے۔ مستی میں بھی خرد کے اندر بے راہ روی نہیں ہوتی وہ اپنی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ بے خودی میں بھی وہ اپنے مقام پر قائم ہوتی ہے۔

؎ ازیں باده هر کس که سرمست شد　　بافشاندنِ گنجِ زر دست شد
بمستی خرد رهنمائے خود است　　مددگر ز خود هم بجائے خود است

ظہور اور سرور کا تعلق عقل و علم سے جس انداز کا ہے اس کے متعلق اقبالؔ کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن　　یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

خرد کرده در خود ظهورے دگر　　دل از دیده پذرفته نورے دگر
ز گنجے که بینش به ویرانه ریخت　　در آفاق طرحِ پریخانه ریخت
ز دودن ز آئینه زنگار برد　　ز دانش نگه ذوقِ دیدار برد

عقل، بصیرت اور بینش کا نام ہے۔ اگر بینش درست ہو تو اس سے دل کو بھی نور حاصل ہوتا ہے۔ جس شخص میں بصیرت نہیں اور جسے علم نے آئینِ حیات اور جمالِ کائنات سے آگاہی نہیں بخشی اسے جہان میں ویرانہ پن ہی نظر آئے گا۔ عقل ہی سے آفاق کا ویرانہ پریخانہ دکھائی دیتا ہے ؎

دیده ور آں که تا نهد دل بشمارد لبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری

عقل دل و دماغ کے آئینے سے زنگار دور کرتی ہے تو دانش کو ذوقِ دیدار حاصل ہوتا ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ مجھ ایسا اوباش زندگی سے محض رنگینی کی دریوزہ گری کر رہا تھا لیکن عقل نے اس کی بینش درست کر دی تو وہ آفرینش کے متعلق صحیح باتیں لکھنے لگا۔ عقل جب تفکر اور اندیشے میں استعمال ہو تو اسے عقلِ نظری کہتے ہیں لیکن عقل کا کام صرف نظر پیدا کرنا نہیں، اس کا وظیفہ سیرت کی درستی بھی ہے۔

جب وہ کردار کو منظم کرتی ہے تو عمل میں اچھے نتائج نکالتی ہے ؎

درین حلقہ او باشِ دیدار جوی — پدر ویزۂ رنگ آوردہ روی
خرد کردہ عنوانِ بینش درست — رقم سنجِ آفرینش درست
ز اندیشہ دم زد نظر نام یافت — بکردار رفت از اثر کام یافت

غصہ اور حرص اسی کی سطوت سے مغلوب ہو سکتے ہیں۔ انسان نے جو بھیڑیوں، جنگلی خنزیروں اور تمام درندوں پر غلبہ حاصل کیا ہے تو وہ عقل ہی کی قوتِ تسخیر سے کیا ہے۔ انسان کے اندر چھپی ہوئی درندگی اور بہیمیت پر بھی عقل ہی قابو پا سکتی ہے۔

چناں سطوتش راز بون خشم و آز
کہ فرمانِ او بردہ گرگ و گراز

عقل کا کام جذبات کو فنا کرنا نہیں انسان کے اندر جو جذبات اور میلانات پیدا کیے گئے ہیں وہ زندگی کی بقا اور اس کی تکمیل کے لیے ہیں۔ عقل ان جذبات کا رُخ اچھے مقاصد کی طرف پھیر دیتی ہے۔ قوتِ غضب اس کی بدولت شجاعت جیسی خصلتِ حسنہ بن جاتی ہے۔ حیوانی شہوات حدود کی پابند ہو کر اعتدال پیدا کر لیتی اور عفت کی صورت اختیار کر کے انسان کو قانع بنا دیتی ہیں ؎

غضب را نشاطِ شجاعت دہد
ز خواہش بہ عفت قناعت دہد

عقل زور آزمائی بھی کرتی ہے تو اندازے سے کرتی ہے۔ شوق کی سرمستی کے باوجود وہ پارسا ہی رہتی ہے۔ انسان کی جبلتیں اچھی عادتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور نظر میں حصولِ سعادت کی کیمیا گری پیدا ہوتی ہے۔ کیمیا کا کام ادنیٰ عناصر سے اعلیٰ مرکبات بنانا اور پست عناصر کو اکسیر میں تبدیل کرنا ہے۔ عالمِ طبیعی میں

بھی عقل یہی کام کرتی ہے۔ اور عالمِ نفسی میں بھی اس کا وظیفہ یہی ہے۔

باندازہ زور آزمائی کند — خورد بادہ و پارسائی کند
منشہائے شائستہ عادت شود — نظر کیمیائے سعادت شود

انسان کے جذبات اور اس کی عقل کی باہمی نسبت کچھ اس تمثیل سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار شکار کو جا رہا ہے اور اس کے ہمراہ ایک جگر خوار چیتا ہے۔ اگر وہ عقل سے کام لے تو اس کا گھوڑا بھی بے عنان ہو کر ادھر ادھر نہ کودے گا اور شکار کرنے میں یہ چیتا بھی اس کا مطیع فرمان رہے گا۔ جو شخص باگیں اچھی طرح سنبھال سکے اور چیتے کو بھی مطیع کر کے اس سے کام لے سکے وہی صید افگنی کر سکتا ہے ؎

چناں داں کہ مرشے ورا سپے سوار — بدشتے رُخ آوردہ بہرِ شکار
جگر خوارہ یوزیست ہمراہِ او — جگر خوارئ یوز دل خواہِ او
کند گر باندیشہ رفتار ہا — نگہ دار اندازۂ کار ہا
نگیرد سمندش رہِ توسنی — بود رام یوزش بہ صید افگنی

افلاطون کے ہاں عقل اور جذبات کی یہی تمثیل ملتی ہے کہ انسانی نفس ایک رتھ کی طرح ہے جس کے آگے شہوات و جذبات کے گھوڑے لگے ہیں اور باگیں عقل کے ہاتھ میں ہیں۔ شہوات و جذبات زندگی کی گاڑی کھینچتے ہیں۔ کوئی کام ادنیٰ ہو یا اعلیٰ خواہش یا جذبے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ عقل کا کام ہدایت ہے۔ گاڑی کھینچنے کی قوت اس میں نہیں۔ نفس کشی کے معنی اگر شہوات و جذبات کو مار ڈالنا یا معطل کر دینا ہو تو یہ نفس کشی نہ ہو گی بلکہ خود کشی ہو گی۔ انسان کو فطرت نے عقلِ خالص نہیں بنایا۔ انسانی زندگی کی تکمیل جذبات سے کام لینے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اسلامی اخلاقیات کا

زاویۂ نگاہ بھی یہی ہے۔ مومن کی تعریف یہ نہیں کہ اس میں بدنی شہوات کا فقدان ہوتا ہے۔ خدا نے کوئی چیز، کوئی صنعت، کوئی ملکہ عبث پیدا نہیں کیا۔ ابلیس کی بھی حکیمانہ تاویل یہی ہے کہ وہ زندگی کی ایسی قوتوں کا نام ہے جو ابھی ہدایت کے زیرِ نگین نہیں۔ اگر ہدایت نہ ہو تو شہوات اتارہ ہو جاتی ہیں لیکن اگر اُنھیں عقل اور بلند مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ حیات آفرین بن جاتی ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول کریمؐ نے اصحاب کے سامنے بیان فرمایا ہر شخص کے ساتھ اس کا شیطان لگا ہوا ہے۔ ایک سامع نے پوچھا کہ کیا حضورؐ کے ساتھ بھی ہے؟ فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ہے لیکن میں نے اسے مسلم اور مطیع کر رکھا ہے۔ غالبؔ نے افلاطون کے رتھ کی تمثیل ذرا بدل دی ہے اور ایک اسپ سوار شکاری اور چیتے کی مثال سے کام لیا ہے۔ اگر سوار چابک دست نہ ہو تو گھوڑا شکار کی پیروی کے بجائے چراگاہ کا رُخ کرے اور ادھر اُدھر درختوں میں منہ مارتا پھرے یا بے عنان ہو کر سنگلاخ زمین میں تگ و دو شروع کر دے، بے کارگری سے اس کا مغز کھولنے لگے اور اس کے ہمراہ چیتے کے پاؤں کانٹوں سے زخمی ہو جائیں۔ گھوڑے کے پیٹ میں پُرخوری سے نفخ پیدا ہو اور چیتے کی زبان گرمی سے چاک چاک ہو۔ سوار بے راہ روی سے پریشان ہو جائے اور کوئی شکار ہاتھ نہ آئے۔ جب گھوڑا سوار کے اختیار میں نہ ہے تو سوار کی جان کی خیر نہیں ؎

دگر دشت پیما ہنر پیشہ نیست شناسائے فرجام اندیشہ نیست
چرد در چراگاہ تا برگ و شاخ رود در پئے صید در سنگلاخ
بجوشد بہ سر مغز رخش از تموز بہ خارا شود سُفتہ چنگالِ یوز
بستی یکے گشتہ پولاد پای زتندی یکے رفتہ پولاد خای
مرایں را زپُرّی شکم باد خاک مرآں را زگرمی زباں چاک چاک

سوار اندریں ہرزہ گردی نژند نہ رویش بہ راہ و نہ صیدش بہ بند
سوارے کہ رخشش نہ فرماں برد ندانم کہ بے چارہ چوں جاں برد

عقل انسانی زندگی کی رہنما ہے۔ انفس و آفاق کے اکثر مظاہر علت و معلول، اثر و سبب کی کڑیاں اس کے ادراک میں آسکتی ہیں۔ اسی ادراک کی بدولت وہ فطرت کی تسخیر کر کے اسے انسانی مقاصد کے حصول میں استعمال کرتی ہے۔ لیکن حیات و کائنات اور اسرارِ وجود کی کوئی انتہا نہیں۔ کلماتِ ربّی جن سے موجودات کے تمام آئین سرزد ہوتے ہیں ان کی لاانتہاہی کی نسبت قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ اگر ساری دنیا کے سمندر روشنائی بن جائیں اور تمام درختوں کی شاخوں کے قلم بنائے جائیں تو بھی ان کلماتِ ربّی کا احصاء کر کے کوئی اُنھیں رقم نہیں کر سکتا۔ عالم مظاہرِ صفات کا کچھ حصہ جو انسان کی زندگی سے بالواسطہ یا بلا واسطہ وابستہ ہو سکتا ہے انسان کے ادراک میں آسکتا ہے لیکن حقیقتِ کلی حواس، عقل اور تصور سب سے ماورئی ہے۔ سبحان اللہ وراء الورأ ثم وراء الوراء ثم وراء الوراء سبحان اللہ عمّا یصفون۔ مسلمانوں کی صوفیانہ اور حکیمانہ شاعری میں اور خدا کی حمد میں جابجا اس عجز کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ معرفت کا خواہ کوئی بھی درجہ انبیا و اولیا کو حاصل ہو جائے لیکن آخر میں مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ کا اقرار کرنا پڑتا ہے دیگر اکابر شعرأ کی طرح غالبؔ کے ہاں بھی یہ مضمون اکثر جگہ ملتا ہے کہ اسرارِ حیات کا انکشاف پوری طرح کسی پر نہیں ہو سکتا۔ اس قدر ظہور کے باوجود حقیقت مستور ہے۔ غالبؔ کے اردو اور فارسی کلام میں اس مضمون کے سات لطیف اشعار ملتے ہیں ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اس پوری غزل میں اپنے وحدتِ وجود کے عقیدے کو عقل کے لیے پریشان کُن سمجھتا اور یہ پوچھتا ہے کہ اس لامتناہی کثرت اور تنوع سے خدا کی وحدت کا رشتہ کیا ہے۔ ایک صوفی کا قول ہے کہ خدا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ماسوا کی حقیقت اور خدا سے اس کا رابطہ سمجھ میں نہیں آتا۔ خیام کہتا ہے کہ ؎

اسرارِ ازل را نہ تو دانی و نہ من — این حرف معمّا نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوئے من و تو — چون پردہ بیافتد نہ تو مانی و نہ من

حافظ کے کلام میں بھی زندگی کے پُراسرار اور ناقابلِ فہم ہونے کے متعلق کثرت سے اشعار ملتے ہیں ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمّا را

کس ندانست کہ منزل گہِ مقصود کجاست — این قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

ایک اور شاعر کائنات کو پرانی کتاب سے تشبیہ دیتا ہے جس کے پہلے اور آخری ورق گر چکے ہوں۔ نہ کوئی دیباچہ ملے اور نہ تمہید، نہ مصنّف کا نام نہ مقصدِ تصنیف اور نہ یہ معلوم ہو سکے کہ آخری باب میں اس طویل قصّے کی تان کہاں جا کر ٹوٹی ہے، ؎

ما ز آغاز و ز انجامِ جہاں بے خبریم
اوّل و آخرِ این کہنہ کتاب افتاداست

اسی مضمون کے اشعار سے مسلمانوں کی شاعری میں لطیف افکار ملتے ہیں ؎

اے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم — وز ہرچہ دیدہ ایم شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

قصیدہ نوزدہم میں غالب عقلِ فعّال سے کچھ سوالات کرتا ہے ؎

دوش در عالمِ معنی کہ ز صورت بالاست — عقلِ فعّال سراپردہ ز دو بزم آراست

گفتم اسرارِ نہانی ز تو پرسش دارم — گفت جز محرمیٔ ذات کہ بے چون و چراست
گفتمش چیست جہاں گفت سراپردۂ راز — گفتمش چیست سخن گفت جگر گوشۂ ماست
گفتم از کثرت و وحدت سخنے گوی برمز — گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست
گفتم آیا چہ بود کشمکشِ ردّ و قبول — گفت آہ از سرِ این رشتہ کہ در دستِ قضاست

گفتمش ذرہ بہ خورشید رسد گفت محال
گفتمش کوششِ من در طلبش گفت رواست

کل عالمِ معنی میں جو عالمِ صورت سے اوپر ہے اس عقلِ کلی نے جو کائنات کی تنظیم کرتی ہے۔ خیمہ گاڑا اور محفل لگائی کچھ دیدہ ور وہاں طلب کیے گئے۔ میں بھی حاضر ہؤا اور عرض کی کہ میں آپ سے زندگی کے سربستہ رموز پوچھنا چاہتا ہوں جواب ملا کہ ہاں شوق سے پوچھو۔ لیکن صفات و مظاہر و آثار کی بابت جو پوچھو گے اس کا جواب ملے گا مگر تم حقیقتِ مطلقہ اور ذاتِ الٰہی کے محرم نہیں ہو سکتے۔ عقل کا کام کیف و کم اور چون و چرا اور اسباب و علل سے آگاہی کی کوشش ہے۔ لیکن جہاں منطق اور علّت و معلول کے قوانین کا اطلاق نہ ہوتا ہو اس کے متعلق سوال و جواب بے کار ہے۔ پھر میں نے عرض کی کہ اچھا ذاتِ باری کے متعلق سکوت ہی سہی لیکن جہان کی نسبت فرمائیے کہ یہ کیا چیز ہے۔ جواب ملا کہ جہان بھی سراپردۂ راز ہے۔ پھر غالب کو خیال آیا کہ پوچھوں متاعِ سخن کی نسبت کیا ارشاد ہے۔ جب محرمیٔ ذات بھی میسّر نہ آ سکے اور جہان بھی سراپردۂ راز ہی رہا تو پھر سخن آرائی کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ جواب ملا کہ اس کے باوجود سخن ہمارا جگر گوشہ ہے۔ یعنی عقل اور سخن ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ناطق ہونے میں عقل اور سخن دونوں داخل ہیں۔ اس سے غالب کو کچھ تو تسلّی ہوئی کہ اس کا مخصوص سرمایۂ حیات یعنی سخن بے کار نہیں۔ پھر خیال آیا اپنے مخصوص مذہب یعنی عقیدۂ وحدۃ الوجود کے متعلق کھل کر نہیں تو

رمز ہی میں کچھ بتائیے کہ وحدت اور کثرت کا باہمی رابطہ کیا ہے۔ اس سوال کا جواب غالبؔ کو عام روایتی انداز ہی کا ملا کہ لہریں اور بُلبلے بھنور اور جھاگ دریا ہی کے مختلف کوائف ہیں اور ان کی حقیقت دریا سے الگ نہیں۔ پھر تصوف کا ایک اور مسئلہ دریافت کیا۔ اکثر صوفیہ کا عقیدہ تھا کہ انسان اپنی انفرادیت اور خودی ترک کر کے اتحاد یا حلول سے ذاتِ الٰہی میں مِل سکتا ہے۔ اس کے متعلق عقلِ فعّال نے کہا کہ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ذرہ خورشید نہیں بن سکتا۔ شیخ اکبر سب سے بڑے وجودی شمار ہوتے ہیں۔ وہ بھی فرماتے ہیں کہ رب تنزلات کے باوجود رب ہی رہتا ہے۔ اور بندہ خواہ کتنی ہی ترقی کرے وہ بندہ ہی رہے گا الربّ ربّ وان تنزّل - والعبد عبد وان ترقّی - پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ذرّے کا خورشید بننا محال ہے تو اس بارے میں اس کی کوشش سعیٔ لاحاصل سمجھی جائے۔ عقلِ فعال نے جواب دیا کہ یہ کوشش روا ہے کیونکہ اس سے ذرّے کو لامتناہی ارتقا حاصل ہوتا رہے گا۔ ذرّے کا مقصودِ حیات یہی ہے کہ وہ خورشیدِ ازلی سے قرب کی کوشش میں مصروف رہے۔ ان تمام جوابات کا لب لباب یہی نکلتا ہے کہ ہستی کی حقیقتِ مطلقہ بھی بے چون وچرا ہے۔ اور جہاں بھی سراپردۂ راز ہے وحدت وکثرت کے رابطے کا بھی کوئی تشفی بخش جواب نہیں فقط ایک تمثیل سے 'ہمہ اوست' کا عقیدہ دہرا دیا ہے جس سے کوئی مشکل حل نہیں ہوتی اور یہ سوال بے جواب ہی رہ جاتا ہے ؎

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

خیر و شر کا مسئلہ بھی اپنی جگہ جوں کا توں رہا۔ بعض لوگ دنیا میں مقبول دکھائی دیتے ہیں اور بعض مردود۔ بعض چیزوں کو خدا یا فطرت قابلِ قبول قرار دیتی ہے اور بعض کو قابلِ ردّ، حالانکہ یہ سب کچھ خود آفرینش میں موجود ہے۔ اور خدا کی آفرینش

میں کوئی چیز باطل نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود باطل کے وجود کا منکر نہ فلسفہ ہے اور نہ کوئی دین۔ اس سوال کا جواب عقلِ فعّال نے ایک آہِ سرد ہی سے دیا ہے کہ یہ رشتہ قضا کے ہاتھ میں ہے۔ اور قضا کا آئین خالقِ قضا ہی کو معلوم ہوگا۔ البتہ آخری شعر میں ضرور بصیرت افروز حکمت ہے کہ خدا زندگی کا سرچشمہ بھی ہے اور اس کا نصب العین بھی وہ اوصافِ کمال کا حامل ہے والی ربک المنتہیٰ اس منتہا کو مخلوق کبھی نہیں پہنچ سکتی لیکن اس منتہا کی طرف لامتناہی ارتقا اور زیادہ سے زیادہ قرب کی کوشش زندگی کے لامحدود ممکنات کو معرضِ شہود میں لاتی ہے۔ نہ سخن بے کار ہے اور نہ عمل بشرطیکہ وہ حقیقت رسی میں معاون ہو۔

جس غزل کا مطلع دیدہ وری کے مضمون میں ہم پہلے درج کر چکے ہیں ؎

دیدہ ور آں کہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آزری

اس کے دوسرے شعر میں غالبؔ نے اس نکتے کو کسی قدر شوخی سے ادا کیا ہے کہ فرشتے بھی خدا رس نہیں۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ ملائکہ عرشِ عظیم کے قریب اور اس کے گرداگرد رہتے ہیں، اور بہت سے ایسے ہیں جو عرش کے حامل ہیں (فلک العرش بجوم خم دوشِ مزدور۔ غالبؔ) وہ ہر وقت خدا سے فرامین حاصل کرتے اور کائنات کے مختلف شعبوں کے متعلق خدا کو رپورٹ دیتے ہیں۔ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر ان کا صعود و نزول ہوتا رہتا ہے۔ اُنھیں براہِ راست خدا کی رویت حاصل ہوتی ہے۔ اور قرب کی وجہ سے ذاتِ الٰہی کا علم رکھتے ہیں۔ غالبؔ اس کی تردید کرتا ہے۔ فرشتے بھی بندگانِ الٰہی ہیں، وہ اپنے وظائف اور فرائض ادا کرتے ہیں۔ حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ فطرتاً فرماں بردار ہیں۔ ارض و سما کے درمیان ان کی پرواز مسلّم ہے وہ طائرانِ لاہوتی ہیں لیکن ذاتِ الٰہی تک ان کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ ملائکہ میں

سب سے زیادہ مقتدر فرشتہ بھی معینہ حدود سے آگے پرواز نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کرے تو فروغِ تجلّی سے اس کے پر جل جائیں۔ انسان کے لیے خدارسی اور معرفت ذاتِ الٰہی کے معاملے میں فرشتوں پر رشک کرنا بے جا ہے ؎

رشکِ ملک چہ و چرا، چوں بتو رہ نمے برد
بیہُدہ در ہوائے تو می پرد از سبک سری

خلقت خالق کی نشاندہی ضرور کرتی ہے۔ اور ہر ذرے کا رُخ اسی کی طرف پھرا ہوا ہے۔ اہلِ بصیرت کے لیے خود کائنات خالق کی خلّاقی پر شہادت دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حقیقتِ ازلی ورائے ادراک ہے ؎

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز برہِ تو روئے نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

اس کے علاوہ انسان کا نفس اور اس کی فطرت بھی اس کی شاہد ہے۔ ہر نفس کے اندر خدا کا اقرار مضمر ہے ؎

کانٹا ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا   حلقہ ہے ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور   بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا   حالیؔ

اس مضمون کو غالبؔ نے اس طرح بیان کیا ہے جب خدا کوئی دل پیدا کرتا ہے تو اس کی فطرت ایسی بناتا ہے کہ اس پر خود اس کی ذات ہی میں سے خالق و مالک کی مُہر لگ جاتی ہے۔ یہ مُہر خدا خارج سے اس پر نہیں لگاتا خود دل کے اندر ہی سے اُبھرتی ہے اگر کوئی انسان کُفر اور خدانا شناسی سے اپنا دل غیرِ خدا کے حوالے کرے تو خدا دعوے سے اسے واپس لے سکتا ہے۔ اور اس دعوے کا ثبوت وہی مُہر ہوتی ہے جو ہر دل پر خود اس کی فطرت نے ثبت کر رکھی ہے ؎

ہر کہ دل است در برش، داغِ تو در نہادِ دل   تا چو بدیگرے دہد باز بری بداوری

سوال یہ ہے کہ خدا کی ذات تک رسائی کیوں نہیں ہوتی؟ کیا وہ خود مستور رہنا چاہتا ہے۔ کیا اسے ظہور کا شوق نہیں غالبؔ کہتا ہے کہ مستوری خدا کا مقصد نہیں حسین انسانوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ

نکو رو تابِ مستوری ندارد
چو در بندی سر از روزن برآرد

ہر قسم کے جمال اور ہر نوع کے کمال والا انسان چاہتا ہے کہ اس کا جمال یا کمال دوسروں پر ظاہر ہو خدا جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ جمال کے لئے اظہار ضروری ہے لیکن عجزِ ادراک کی وجہ یہ ہے کہ چشمِ باطن ہو یا چشمِ ظاہر اس جمالِ حقیقی کی تاب نہیں لا سکتی ؎

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

غالبؔ کہتا ہے نگہِ نارسا کو بھی خوشخبری دو کہ حسنِ دوست خود عرضِ جلوہ کا مشتاق ہے۔ آشفتگی اور واماندگی خود خدا تک پہنچنے کے راستے ہیں۔ اوجِ فنا پر بھی آشفتگی کی پرواز ہوتی ہے، اور راہِ طریقت میں پائے خفتہ کی رگیں خود جادہ بن جاتی ہیں ؎

مشتاقِ عرضِ جلوۂ خویش است حسنِ دوست   از قرب مژدہ دہ نگہِ نارسائے را
آشفتگی بر اوجِ فنا بال می زند   اے شعلۂ داغ گردد نگہ دار جائے را
واماندگیست بے سپرِ وادیٔ خیال   شوق تو جادہ کرد رگِ خواب پائے را

ایک اور غزل میں عالم کے پُر اسرار ہونے کا ذکر کرتا ہے جو کچھ ظاہر ہے وہ بھی راز ہے اور جو کچھ باطن میں ہے وہ بھی راز ہے۔ اس راز کی پردہ کشائی فکر و اندیشہ

کے بس کی چیز نہیں لیکن کم از کم نگاہ پیدا کرنی چاہیئے جو زندگی کو پُراسرار سمجھ کر آئینۂ حیرت بن جائے۔ یہ حیرت علم سے بھی افضل چیز ہے اور اس حیرت کو حقیقت سے جو رابطہ ہے وہ تفکر کو حاصل نہیں۔ علم را بفروش و حیرانی بخر۔ اس لیے کہ علم استدلال کی بھول بھلیاں ہے اور حیرت نظر ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ حکمت حیرت سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس نے آگے قدم بڑھا کر وہ بات نہیں کی جو صوفیہ کرام کا وجدان ہے کہ حکمت حیرت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور انجام کار حیرت ہی میں ڈوب جاتی ہے۔ عارف رومیؒ کہتے ہیں کہ حیرت دو قسم کی ہے۔ (۱) جاہل کی حیرت۔ (۲) عارف کی حیرت۔

جاہل کی حیرت اس وجہ سے ہے کہ وہ حقیقت کی طرف پشت کیے ہوئے ہے۔ اور عارف کی حیرت حقیقت کے روبرو ہونے سے پیدا ہوتی ہے ؎

کاملے گفت است می باید بسے　　عقل و حکمت تا شود گویا کسے
باز باید عقل بے حد و شمار　　تا شود خاموش یک حکمت شعار

بعض فلسفے اور بعض متصوفانہ مذاہب حیات گریز ہوتے ہیں۔ پہلے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ فکر و عمل سے رسائی نہیں ہو سکتی۔ پھر معنی کے مقابلے میں صورت کو بے اصل قرار دے کر جہانِ آب و گل کو محض سیمیا یا فریبِ ادراک قرار دیتے ہیں۔ اسلامی تصوف میں جس کی بنا قرآنی تعلیم ہو یہ غلط نگاہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ھو الظاہر و ھو الباطن حقیقت کا جو باطن ہے وہ ظاہر میں بھی اظہار پذیر ہوتا ہے۔ کائنات بھی روئے دوست ہے۔ کائنات میں ہر شے صفاتِ الٰہیہ کی مظہر ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ معنی تک رسائی نہ ہو تو صورت کا جلوہ بھی کیا کم ہے۔ انسان محرمِ ذات نہ ہو سکے تو محرمِ صفات تو ہو سکتا ہے ؎

عالم آئینۂ رازاست چہ پیدا چہ نہاں　　تاب اندیشہ مذاری بہ نگاہے دریاب
گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است　　خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہے دریاب

عالم کے سراپردۂ راز ہونے کے متعلق اردو میں بھی غالبؔ کا ایک لاجواب شعر ہے۔ حقیقت کے چہرے پر نقاب و حجاب موجود ہے۔ لیکن نواہائے راز سے آشنا شخص کے لیے یہ پردے ساز کے پردے بن جاتے ہیں۔ زندگی کے پردے گویا پردے ہیں معنی کے مقابلے میں صورت کوئی دیوار نہیں، اگر اسے دیوار کہیں تو یہ دیوار عجب قسم کی ہے جس کے نقش زبانِ حال سے گویا ہیں۔ دیوار ہم گوش دارد تو مشہور ہے۔ لیکن اس دیوار کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ دیوار ہم زبانے دارد ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفیؔ کے ہاں بھی ایک مماثل مضمون ملتا ہے۔ جاہل اپنے محدود معلومات کو علم سمجھتا ہے۔ اور اسے یقین ہوتا ہے کہ جن اشیاء و حوادث سے اسے واسطہ پڑتا ہے وہ ان کی حقیقت کو جانتا ہے۔ لیکن موجودات کے اسرار سے آشنا ہونے والا حکیم معلوم کو بھی نامعلوم سمجھتا ہے۔ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد ؎

جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی　　معلوم ہوا کہ کچھ نہ معلوم ہوا

جاہل خدا شناسی کے لیے معجزات کرامات اور خرقِ عادت کا طالب ہوتا ہے۔ اگر اس میں بصیرت پیدا ہو جائے تو وہ یہ سمجھ لے کہ فطرت کا ہر عمل ایک معجزہ ہے۔ یعنی پوری طرح اس کی حقیقت سمجھنے سے انسان عاجز ہے۔ عرفیؔ کا شعر ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است